اظہر کلیم سے ملاقات

(انٹرویو)

میزبان : عائشہ عذرا شیریں

اشاعت : ماہنامہ آنچل کراچی

تشکیلِ نو : سید فہد حسینی

پیشکش : **انتظامیہ دی گریٹ ابن صفی فینز کلب**

قارئین کے پُر زَور اصرار پر نئے اُفق کے ایڈیٹر اظہر کلیم سے مُلاقات۔ اظہر کلیم جو اپنے ظاہری تَن و توش سے کہیں بڑا آدمی ہے۔ وہ جب کام کرتا ہے تو ایک دیانتدار مزدور ہوتا ہے۔ دوستی کرتا ہے تو ایک سچا دوست ہوتا ہے۔ گھر میں ایک مہربان شوہر اور ایک شفیق باپ ہوتا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک اچھا انسان اور بہترین رفیق ہے۔ میرے ایک دوست اسے ”پہلوان قلم“ کہتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کیونکہ وہ اپنے قلم سے اتنا کام لیتا ہے کہ شاید ہی اس صدی میں کسی اور نے لیا ہو۔ کم از کم پُورے ایشیا میں اس قدر تیز رفتار اور اتنا زیادہ لکھنے والا میری نگاہ سے کوئی اور نہیں گذرا۔ وہ ایک سچا اَدیب ہے۔ اپنے پیشے اور فن سے بے حد مخلص ہے۔ میں اظہر کلیم کے بارے میں زیادہ نہیں لکھوں گا کیونکہ محترم خان آصف (جنہیں اظہر کلیم اپنے استادوں میں سے ایک کہتا ہے) نے اس کے بارے میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ حرفِ آخر ہے۔

مشتاق احمد قریشی

یقیناً ڈائجسٹوں کے لیے اظہر کلیم ایک بڑا نام ہے مگر پہلے وہ، میرا دوست ہے، بعد میں ایک مصنف، ایک اَدیب، ایک مترجم اور تخلیق کار..... میں نے اُسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جب وہ، فیصل آباد سے کراچی آیا تھا تو اُس کی ظاہری شخصیت کشش انگیز تھی۔ دلکش نقش و نگار رکھنے والا، ایک تندرست و توانا، سُرخ و سفید نوجوان۔ وہ پہلی نظر میں لوگوں کو متاثر کرتا تھا مگر لوگ چاہتے تھے کہ اس خطہ سنگریز میں، اُس کا شاداب چہرہ، مسخ ہونے کی حد تک کملا جائے، رنگت زرد ہو جائے یا پھر پیٹرول اور ڈیزل کے دُھوئیں سے مشابہت اختیار کرلے۔ لوگ اپنے سینوں میں یہ اذیّت ناک خواہش کیوں رکھتے ہیں؟ میں، اس راز کو آج تک نہیں سمجھ سکا.... بس، اَظہر کلیم کو سڑکوں پر دُھوپ میں جلتے ہُوئے دیکھتا رہا۔ وہ فطری طور پر ایک جفاکش نوجوان تھا۔ اس لیے اپنے آپ کو معاشرے کے سُپرد نہ کر سکا بلکہ مخالف عناصر سے جم کر لڑا۔ یہاں تک کہ کامیاب ہو گیا۔

وہ 1975ء تک میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں نے بڑے عجیب انداز میں، راتوں کے ساتھ، کاغذ بھی سیاہ کیے ہیں۔ پارکوں میں بیٹھ کر، انگریزی پرچے پڑھے ہیں.... پھر اُنھیں، اُردو میں منتقل کیا ہے۔ وسائل کی دُنیا، ہم پر ہنستی تھی اور ہم، منزل کی تلاش میں بڑھتے چلے جاتے تھے۔ سفر کا یہ انداز کوئی دو۲ سال برقرار رہا۔ کیسے کیسے موسم آئے، کیسی کیسی ہَوائیں چلیں، کچھ اَندازہ نہیں.... ہاں، کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ.... اب جس جگہ کہ داغ ہے، یاں پہلے درد تھا۔

.... پھر راستے بدل گئے۔ اَظہر کلیم کامیابی کی شاہراہ پر چلا گیا۔ اُسے جانا ہی چاہیے تھا۔ کامرانی کے بغیر آدمی ادھُورا ہے۔ اُس نے بڑے سلیقے سے اپنے آپ کو مکّمل کرنے کی کوشش کی۔ کون سا ڈائجسٹ ایسا ہے جس میں اُس کی تحریریں شائع نہیں ہُوئیں۔ یہ، اُس کا حق تھا۔ اُس نے شہرِ نُصرت میں دَاخل ہونے کے لیے کوئی نقب نہیں لگائی تھی۔ وہ فکشن کا ایسا طالبِ عِلم تھا جو اپنے گردوپیش سے سبق حاصل کرتا تھا، ایک ایک حرف سیکھتا تھا.... لہٰذا اب اگر اُس نے اُستادی کا درجہ حاصل کر لیا ہے تو لوگ حیرت میں کیوں مبتلا ہیں؟ جاں سوزی اور شب بیداری کا کچھ توصِلہ ہونا چاہیے۔

اَظہر نے مغربی کہانیوں کے علاوہ، بعض ٹیکنیکل کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ پُراسرار اور جدید عُلوم پر اُس کی ایک پُوری سیریز موجود ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر کام ہے۔ میں نے اُن میں سے کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ بڑی سلیس اور عام فہم زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ اظہر کلیم کی اضافی خصُوصیت ہے۔ ایسے خُشک موضوعات پر تحریریں اکثر بے جان ہو کر رہ جاتی ہیں.... مگر پاکستان کے اس لائق مترجم نے اُن کی شگفتگی کو آخری سطر تک قائم رکھا ہے۔

ترجمہ، اُس کے لیے کوئی شرف نہیں۔ میری نظر میں وہ بُنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہے۔ اُسے، بیرُونی اَدب کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے پیروں پر نہ صرف کھڑا ہو سکتا ہے بلکہ تیز رفتاری کے ساتھ چل بھی سکتا ہے۔ اُس کا اپنا ذہن اور اپنی سوچ ہے جس کا اندازہ، اُس کی مشہور سلسلے وار کہانی ”شہباز“ سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ہر ماہ، سینکڑوں صفحات لکھتا ہے۔ اس مشینی انداز میں لفظوں کی تجارت کرنا، ایک مشکل کام ہے۔ اگر وہ، اَدب کے ”کمرشل ایریا“ سے باہر آ

جائے تو مزید دلکش تحریریں پیش کر سکتا ہے.... لیکن وہ، اس حصار سے باہر کیسے آسکتا ہے؟ ہم نے یہ مانا رہیں دلّی میں، پر کھائیں گے کیا؟

اس سُود خور معاشرے میں حرفوں کی روٹی سے شکم کی آگ بجھانا بِلاشُبہ ایک کارنامہ ہے اور ہمیں فراخ دِلی کے ساتھ اظہر کلیم کے اس کارنامے کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ میرے خیال میں کسی ماہنامے کی ادارت، اُس کے لیے اعزاز نہیں۔ اظہر کلیم فطرتاً مصنّف ہے۔ ''جہاں چاہے گا وہ روشن چراغ یاد کرے گا۔'' صلاحیّت و محنت کبھی کبھی محصُور تو ہو جاتی ہے مگر کسی کی غلام نہیں بن سکتی۔ اظہر کلیم ''قبیلہ ٔ آزاداں'' کا ایک فرد ہے۔ اُسے اپنی اس نسبت کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

میرے اور اظہر کے تعلّقات کا ناگوار ترین لمحہ وہ تھا جب مجبُوریوں نے ہم دونوں کے دَرمیان ' خطِ جُدائی کھینچ دیا تھا.... اور جاں فزا ساعت وہ تھی جب اُس نے مجھ سے کہا تھا۔ ''یہ میرا ذاتی مکان ہے۔'' میں نے غور سے اس چار دیواری کو دیکھا.... پھر میری نظر لان پر گئی جہاں کچھ معصُوم بچّے کھیل رہے تھے۔ ایک تخلیق کار کی آل، ایک اَدیب کے بچّے، زمین کی بے گانگی کے خوف سے دُور، اپنی چھوٹی سی مُملکت میں مسرُور، اُس قلم کار اور مزدُور باپ کی ہنستی، گاتی نشانیاں، جس کے بال اب دھُوپ کی تمازت سے سفید ہو چلے ہیں۔

جب میں نے اظہر کے مکان پر، ڈھلتی ہُوئی رات کے سنّاٹے میں، اُس کی محنت اور منصُوبہ بندی کی تعریف کی تھی تو اُس نے میری بات کا جواب دے کر، مجھے چونکا دیا۔ ''یہ سب کچھ رَبِّ عظیم کی عنایت ہے۔ دُنیا میں اس کے سوا کسی دوسری شے کا وجُود ہی نہیں۔''

بے شک! زمینوں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، وہ اپنے رب کی تسبیح کر رہا ہے۔ اگر اظہر کلیم نے اپنی کامیابیوں کا سہرا، اپنی ذات سے ہٹا کر معبودِ حقیقی سے معنون کر دیا اور اپنے خالق کی عظمت بیان کی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ ہر شے، اپنی اصل کی طرف ہی رجوع کرتی ہے۔

خان آصف

☆ہمارے معاشرے میں بلا تحقیق الزام لگانے اور بغیر دَلیل کے بحث کرنے کا رواج کچھ زیادہ ہی ہے.... ڈائجسٹوں کے بارے میں کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ کئی الزامات سُننے میں آتے ہیں مگر دلیل سُننے میں نہیں آتی۔ ہم اس سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کر کے آپ کی نظر میں جانبدار قرار پانا نہیں چاہتے بلکہ اس کے لئے ہم نے پڑھے لکھے اور مہذّب لوگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہُوئے، ڈائجسٹوں کے بارے میں ہر طرح کا نقطۂ نظر رکھنے والے طبقوں سے گفتگو کی۔ الزامات و سوالات جمع کئے پھر ایک ایسی ہستی کی تلاش شروع کی جس کا ڈائجسٹوں سے عملی تعلق نہایت گہرا ہو، وہ محض لفظوں کی سطح پر تیر کر بات نہ کرے، حقائق کی گہرائیوں تک رسائی رکھتا ہو۔ ایسی شخصیت کا انتخاب خاصا مشکل مرحلہ تھا۔ بہر حال، ہم اس میں بھی کامیاب ہو ہی گئے۔

اس ساری جِدّ و جُہد کے دوران بعض اوقات ہمیں محسُوس ہُوا کہ اس اَدبی اور صحافتی میدان کا سب سے بڑا دھماکہ بھی ڈائجسٹ ہی ہیں اور سب سے بڑا تنازعہ بھی ڈائجسٹ.... جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ان طبقوں میں ہم نے متعدد اَفراد سے ملاقات کی مگر محسوس یہی کیا کہ اُن کی گفتگو دلیل سے

خالی ہے.... محض قیاسات اور الزامات پر مشتمل ہے اور آپ کو معلوم ہی ہے کہ دُنیا کا سب سے آسان کام قیاس آرائی اور الزام تراشی ہے۔ جبکہ ڈائجسٹوں سے متعلقہ برادری کا جو نمائندہ ہم نے تلاش کیا، اُس کے بارے میں تمام تر غیر جانبداری کے ساتھ ہمیں تسلیم کرنا پڑا کہ اُس کی گفتگو میں دلیل کا وزن بھی تھا اور وہ کرب بھی جو کسی کی نیک نیتی پر شک کرنے کے رَدعمل میں پیدا ہوتا ہے۔ بہر حال، ہم نے تمام تر دیانتداری کے ساتھ سوالات، اُن کے سامنے رکھ دیئے اور اسی دیانتداری کے ساتھ، اُن کے جوابات آپ تک پہنچا رہے ہیں۔ اس طرح آپ کے لئے ایک غیر معمولی اِنٹرویو بھی تیار ہو گیا اور ایک اَہم نوعیّت کا مذاکرہ بھی، جس سے آپ کو سوچ کی کئی گرہیں سُلجھانے میں مدد بھی ملِے گی اور اگر آپ بھی کسی بے جواز تعصّب میں مُبتلا ہیں تو اُس سے چھٹکارہ پانے میں بھی۔

ایک بات ہم عرض کرتے چلیں کہ ہم بے شک بذاتِ خود.... ڈائجسٹ سے وابستہ ہیں لیکن اس وقت ہم، اس طبقے کی نمائندگی نہیں کر رہے بلکہ اس کے مخالفین کی طرف سے الزامات اور سوالات جمع کرنے، ترتیب دینے اور اُن کے جوابات حاصل کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور تحقیقی انداز میں اس معاملے کے ہر پہلُو کو سمجھنے.... اور آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں متعدد افراد سے ہماری ملاقات ہُوئی۔ اپنے طور پر ہم نے اُنہیں مختلف درجوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی تو کچھ عجیب سے ہی نتائج نکلے۔

مثلاً ایک طبقہ وہ ہے جو ڈائجسٹ بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔ اس کے تفریحی مواد سے محظُوظ بھی ہوتا ہے لیکن اپنے سوشل اسٹیٹس یا کسی وجہ سے اس کا اعتراف نہیں کرتا اور اُن کے بارے میں اپنی رائے گول مول رکھتا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو ڈائجسٹوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا، اُسے نہیں معلوم، کس ڈائجسٹ کی کیا پالیسی ہے مگر وہ محض فیشن کے طور پر ڈائجسٹوں کو بُرا کہتا ہے اور اُن پر سُنے سُنائے الزامات عائد کرتا ہے۔ ایک طبقہ اُن لوگوں کا ہے جن کے ہاتھ کسی زمانے میں محض اتفاق سے کوئی ڈائجسٹ لگا تھا اور اس میں کسی غیر ذمےّدار قسم کے ایڈیٹر کی نظرِ عنایت کے سبب اُنہیں کوئی ایسی کہانی پڑھنے کو ملی تھی جو اُن کی نظر میں قابلِ اعتراض تھی اور اُس کے بعد سے اُن لوگوں کی رائے ہر ڈائجسٹ کے بارے میں ہمیشہ کے لئے خراب ہو گئی۔

بہر حال، ہم نے اپنی دانست میں ہر طرح کے لوگوں کے نقطہ ہائے نظر جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے لئے جن صاحب کو منتخب کیا ہے، اُن کا نام ہے، اظہر کلیم.... ممکن ہے کہ آپ نام پڑھ کر ہی جان گئے ہوں کہ یہ کون صاحب ہیں، کیا کرتے ہیں اور کیا کچھ کرتے رہے ہیں جو بہنیں (اور وہ بھائی بھی جو آنچل پڑھتے ہیں) نہیں جانتے اور اگر جانتے ہیں تو بہت کم، اُنہیں اظہر کلیم صاحب کی شخصیّت سے صحیح طور پر متعارف کرانے کے لئے ہم نے ابتدا میں اُن سے سوالات کا دائرہ، اُن کی ذات اور کیریئر تک محدود رکھا ہے۔ ان سوالات سے آپ کو یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ ہم نے اس موضوعاتی انٹرویو کے لئے اُنہیں ہی کیوں منتخب کیا۔

”اظہر صاحب! سب سے پہلے ہم، آپ سے ایک روائتی سوال کریں گے کہ آپ کہاں پیدا ہُوئے اور تعلیمی مراحل کِن کِن اِداروں میں سر کئے؟“ ہم نے انٹرویو کا آغاز کیا۔

اظہر کلیم جو اس سے پہلے خاصی شگفتہ گفتگو کر رہے تھے، اپنی ریوالونگ چیئر پر سنبھل کر بیٹھ گئے اور چہرے پر سنجیدگی طاری کرلی.... گویا اُنہیں احساس ہو گیا تھا کہ باقاعدہ اِنٹرویو شروع ہو چکا ہے۔

”میں، ہندوستان کے شہر جالندھر کے ایک گاؤں ”مداراں“ میں پیدا ہُوا۔“ اُنہوں نے مدّھم لہجے میں جواب دیا۔ ”ایک سال کی عُمر میں والدین کے ساتھ پاکستان پہنچا۔ ابتدائی تعلیم چک لالہ (راولپنڈی) کے ایک اسکول میں حاصل کی.... پھر فیصل آباد کے میونسپل کالج سے ایف۔ ایس۔ سی کیا اور اُس کے بعد، چند ناگزیر وجُوہ کے تحت تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے کراچی آ گیا۔ یہاں وقفے وقفے سے تعلیمی سلسلہ ٹُوٹتا اور جُڑتا رہا۔ اسی عالم میں گریجویشن تو کر لیا لیکن تاحال میں خود کو ایک طالبعلم ہی سمجھتا ہُوں۔“

”اظہر صاحب! ہمارا دُوسرا سوال بھی روایتی سا ہے لیکن قارئین کی خاطر یہ روایت نبھانا ضروری ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کے لکھنے لکھانے کی ابتدا کس طرح ہُوئی؟ پہلے اَدیب بنے یا ایڈیٹر؟ ادیب بنے تو آپ کی پہلی تحریر کس قسم کی تھی؟“

”یہ تو آپ نے ایک سوال کے بہانے کئی سوالات کر دیئے...“ اظہر کلیم مُسکرائے۔

”بہر حال، بالترتیب جوابات کچھ یُوں ہیں کہ میں جب کراچی آیا تو میرے پاس ایک ہی چیز کی بہتات تھی

اور وہ تھا، وقت۔ چنانچہ میں خیالات لکھا کرتا تھا۔ یہ خیالات ایک دوست کے ہاتھ لگ گئے تو اُس نے انکشاف کیا یہ تو خالص اَفسانوی چیز ہے۔ حالانکہ وہ، میرے نہایت حقیقی مشاہدات کا مرقع تھا۔ بہرحال، اُسی دوست نے اُسے کتابی صُورت میں شائع کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کی۔ یہ خیالات ''کنول جلتا رہا'' کے عنوان سے ناول کا رُوپ اَختیار کر گئے۔ طویل افسانہ نما، میرا یہ ناول.... ''محبوب اشعر'' کے نام سے شائع ہُوا لیکن ناتجربے کاری کی وجہ سے پورا ایڈیشن ''فُٹ پاتھیوں'' کی نذر ہو گیا۔ جنہوں نے اس کا عنوان بدل کر دت بھارتی کے نام سے چھاپا اور خوب پیسے کمائے۔ ناول بے حد پسند کیا گیا تھا لیکن مجھے اُس سے نام یا پیسہ کچھ بھی کمانے کا موقع نہیں ملا۔ بلکہ اُلٹا نقصان اُٹھانا پڑا اور بے حد مایوسی ہُوئی۔ اس طرح میں پہلے اَدیب بنا اور ایڈیٹر بننے کی نوبت بہت بعد میں آئی۔ میرے خیال میں یہ میرے ساتھ ہی نہیں ہُوا۔ شاذونادر ہی ایسا ہُوا ہو گا کہ کوئی اَدیب بننے سے پہلے ہی ایڈیٹر بن گیا ہو۔ میری پہلی تحریر ''کنول جلتا رہا'' ہر اعتبار سے ایک اَدبی تحریر تھی اور اس کا ایک ایک لفظ آج بھی میرے دل اور ذہن پر نقش ہے اور اکثر مجھے تڑپاتا ہے کہ میری وہ تخلیق، میرے بجائے دت بھارتی کے نام سے منسُوب ہو گئی۔ بعد میں بھی بارہا ایسا ہُوا لیکن اتنی کسک اور اَذیّت محسوس نہیں ہُوئی۔ پہلی پہلی تخلیق سے معلوم نہیں، سب ہی لکھنے والوں کو زیادہ وابستگی ہوتی ہے یا صرف میرے ساتھ ہی ایسا ہُوا ہے.... شاید اسی کسک نے مجھے اپنے آپ کو اس میدان میں منوانے کی تحریک دی ورنہ ممکن ہے، میں وہی ایک چیز لکھ کر اور یہ سمجھ کر مطمئن ہو بیٹھتا کہ میں نے بڑا تیر مار لیا ہے اور تمام زندگی اسی پر فخر کرنے میں گزار دیتا۔ اپنی اوّلین کاوش کی اس بربادی کے بعد، میں، جاسوسی ناول نگاری کی طرف متوجّہ ہو گیا تھا۔''

''ڈائجسٹوں کی طرف کب متوجّہ ہُوئے اور اب تک اس میدان میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے؟'' ہم نے اُن کے خاموش ہوتے ہی سوال کیا۔

''میں غالباً ۱۹۷۳ء میں ڈائجسٹ کی طرف متوجّہ ہُوا تھا۔'' اظہر کلیم صاحب ذہن پر زور دیتے ہُوئے بولے۔ ''اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہی زمانہ ڈائجسٹ کے ارتقاء کا ابتدائی زمانہ تھا، ہمارے مُلک میں۔ اُس وقت جاسُوسی ناول نگاری کی چادر سے تن ڈھانپنا میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے تین سو پچاس ناول لکھے جن میں سے پچیس، تیس ناولوں کو چھوڑ کر باقی سب دوسرے ناموں سے

شائع ہُوئے۔ اس اعتبار سے میں اپنی تحریروں کو بے وفا تحریریں کہتا ہُوں۔ اُنہوں نے مجھ سے وفا کی بھی تو اُس وقت، جب مجھے، اُن کی وفاداری کی ضرورت نہ رہی۔

"آپ نے پُوچھا ہے کہ میں نے ڈائجسٹ کے میدان میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں؟ تو بہن! کیا یہ کارنامہ نہیں کہ میں آٹھ، نو برس سے اسی میدان میں ڈٹا ہُوا ہُوں اور اَب بھی فرار ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ ویسے انتہائی انکسار کے ساتھ میں "ابنِ صفی میگزین" کو اپنا سب کچھ سمجھ کر کبھی کبھی اپنی ہی ذات میں خوش ہو لیا کرتا ہُوں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ میں اپنا کام خلُوصِ نیت، لگن اور انتھک محنت سے انجام دیتے رہنے کے عمل کو بھی "کارہائے نمایاں" میں شمار کرتا ہُوں۔"

"اس وقت، آپ کے زیرِ ادارت کتنے ڈائجسٹ ترتیب پا رہے ہیں؟" ہم نے پُوچھا۔

"میں اس وقت، محترم ابنِ صفی کے لگائے ہوئے دو ۲ پودوں "نئے اُفق" اور "نیا رُخ" کی آبیاری میں مصرُوف ہُوں اور سُنا ہے کہ خُوب کامیابی سے اپنے فرائض نِبھا رہا ہُوں۔" اظہر کلیم صاحب نے تجاہلِ عارفانہ سے جواب دیا مگر اس میں بھی خود اعتمادی کی ایک جھلک تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ محترم ابنِ صفی کا نام لیتے ہُوئے اُن کے لہجے میں گہری عقیدت شامل ہو گئی تھی۔

ہم نے اچانک فیصلہ کیا کہ کچھ دیر کے لئے اُن کی اکیلی ذات کو پسِ پُشت ڈال کر، محترم ابنِ صفی صاحب کے حوالے سے، اُن سے کچھ سوالات کیے جائیں کیونکہ اپنی زندگی میں محترم ابنِ صفی صاحب کے جن چند اَفراد سے نہایت خصُوصی مراسم اور ایک قسم کا تعلّقِ خاطر رہا، اُن میں سے ایک اظہر کلیم بھی ہیں۔

"اظہر صاحب! فکشن میں محترم ابنِ صفی کو ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ آپ اُن سے کس حد تک متاثر ہیں؟" ہم نے ایک نئے مرحلے کے سوالات کا آغاز کیا۔

"میں سراپا، اُنہی سے متاثر ہُوں۔ بحیثیت ناول نگار بھی اور بحیثیت اِنسان بھی۔ اُن جیسے بے مثل انسان بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں.... اور یہ آپ کی خوش بختی ہوتی کہ آپ کو بھی اُن کی صحبت اور رہنمائی مِیّسر آجاتی۔ اِس اعتبار سے میں اپنے آپ کو خوش بخت سمجھتا ہُوں۔" اظہر کلیم کے لہجے میں اتھا خلُوص اور انمٹ وابستگی کی خوشبُو تھی۔

''محترم ابنِ صفی نے اُردو میں سِرّی اَدب کی بُنیاد رکھی۔ اپنے خُونِ جگر اور بے پایاں تخلیقی صلاحیّتوں سے اِس صنف کو پروان چڑھایا۔ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ اُن کے بعد آنے والے نئی راہیں بناتے، کچھ اور گوشے دریافت کرتے لیکن وہ، اُن کی تعمیر کردہ چار دیواری سے نہ نکل سکے۔ اس ضمن میں اکرم الٰہ آبادی، اظہار اثر، عارف مارہروی، مسعود جاوید اور دُوسروں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ اُن کے کِردار فریدی، حمید یا عمران کی بھونڈی نقل ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا رہا؟'' ہم نے ایک طویل سوال کیا۔

اظہر صاحب نے اس طویل سوال کو نہایت غور سے سُنا.... اور ایک لمحے کے توقّف سے کہا۔

''اگر ہم تمام عوامل کو مدِ نظر رکھتے ہُوئے اس معاملے کا تفصیلی جائزہ لیں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ میں مختصراًاِتنا کہوں گا کہ ایک تو یہ محترم ابنِ صفی کے تخلیق کردہ کرداروں کی دلکشی اور آفاقیت کا ثبوت تھا کہ دیگر مصنفین، اس سے آگے سوچ ہی نہ سکے اور دوسرے، اس صُورتِ حال میں پبلشروں کا بڑا ہاتھ تھا۔ بد قسمتی سے ہمارے یہاں ہر شعبۂ زندگی میں اسی طرزِ فِکر کا راج ہے کہ جو چیز بھی بہت کامیاب ہو جائے، تاجر اُسی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتا ہے۔ ایک فلم ہِٹ ہو جاتی ہے تو فلمساز، کہانی کار سے ضِد کرتا ہے کہ اُسی ٹائپ کی کہانی لکھی جائے.... اور کہانی کار کو چونکہ اسی کام سے روزی کمانا ہوتی ہے۔ اس لئے وہ، اُس کی فرمائش پر سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ یہی معاملہ پبلشنگ لائن کا تھا اور ہے۔ تخلیق چونکہ تخلیق کار کی روزی کا ذریعہ بھی ہوتی ہے اور اس کی فروخت کا انتظام تاجر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لئے تخلیق کار اُس کی فرمائش کا خیال رکھنے پر مجبُور ہوتا ہے۔''

''اسی ضمن میں یہ سوال بھی میرے ذہن میں اُبھرا ہے کہ وطن عزیز میں محترم ابنِ صفی کے تخلیق کردہ کِرداروں کو مَن و عَن استعمال کرکے، اُن کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی۔'' ہم نے ایک نازک پہلُو کی طرف آتے ہُوئے کہا۔ ''اور اس سلسلے میں آپ کا دامن بھی آلُودہ ہے۔ آپ اپنی صفائی میں کیا کہتے ہیں؟''

''میرا معاملہ کچھ عجیب ہی سارہا ہے۔'' اظہر کلیم صاحب مُسکرائے۔ خلافِ توقّع، اُن کے چہرے پر کسی مُجرمانہ شرمساری کی جھلک دِکھائی نہیں دی۔ ''اپنی پوزیشن، مَیں ایک مختصر سے واقعے کی مدد سے واضح کرنا چاہُوں گا.... یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب میں غالباً دوسری یا تیسری جماعت میں پڑھتا

تھا۔ میرے والدِ محترم نے ازراہِ التفات میرے نام خط لکھا۔ گھر والوں نے مجھ سے کہا کہ اس کا جواب ضرور لکھ کر ارسال کرنا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی خط نہیں لکھا تھا اور نہ ہی مجھے لکھنا آتا تھا۔ اپنی دانست میں بڑی عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہُوئے میں نے اپنے والد کا خط سامنے رکھا اور جو کچھ اُنہوں نے لکھا تھا، من و عَن اسی طرح نقل کر کے، نیچے اپنا نام لکھ کر، یہ ''جواب'' ارسال کر دیا۔ اُنہوں نے مجھے ''برخوردار'' لکھا تھا۔ میں نے بھی القاب کی جگہ اُنہیں ''برخوردار'' ہی لکھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جاسُوسی ناول نگاری کے وقت بھی میں، اس میدان میں ایک ننّھا سا بچّہ تھا۔''

''آپ کی یہ بات دِل کو لگی۔ چلیئے، مان لی۔'' ہم نے پینترا بدلتے ہُوئے کہا۔ ''لیکن جب آپ میں پختگی آئی تو آپ نے وہ میدان ہی چھوڑ دیا۔ ایک مصنّف کی حیثیت سے آپ پر یہ ذمّے داری عائد ہوتی تھی کہ آپ ناول کی صنف کو زندہ رکھتے.... مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ڈائجسٹ نے کھالیا بلکہ ڈائجسٹ کر لیا؟''

''کیا آپ کے خیال میں کوئی شخص تنہا، اَدب کی صنف کو زندہ رکھ سکتا ہے؟'' اظہر کلیم صاحب نے اُلٹا ہم سے سوال کر دیا پھر اُن کے لہجے میں شرارت در آئی مگر ہم اس شرارت کی تہ میں چُھپے ہُوئے درد کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ''یقین کیجئے۔'' اُنہوں نے کہا۔ ''ناول کی صنف کو میں نے ختم نہیں کیا، ہمارے معاشرتی اور مُلکی حالات نے ختم کیا ہے۔ مادّی مسائل کا شکار ہو کر تخلیقی اصناف بھی دم توڑ جاتی ہیں۔ البتّہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ ڈائجسٹ نے مجھے کھالیا ہے لیکن ساتھ ہی کھانے کو بھی دیا ہے۔''

'' اسی ضمن میں ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے۔'' ہم نے فوراً کہا۔ ''پہلے آپ ناول لکھتے تھے پھر آپ نے ترجمے شروع کر دیئے.... گویا پہلے تخلیق کرتے تھے۔ اب محض نقل بمطابق اصل تیار کرتے ہیں۔ آپ نے تخلیق کار اظہر کلیم کو کیوں ہلاک کر دیا؟''

''میں ایک بار پھر پہلے والی بات دُہراؤں گا۔ تخلیق کار اظہر کلیم کو میں نے نہیں، وقت نے ہلاک کیا ہے۔ ہر دَور کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ موجودہ دَور، اسی اظہر کلیم کا طلبگار ہے جو آپ کے سامنے موجود ہے۔ باقی جہاں تک ترجمے کا سوال ہے تو آپ کے لہجے سے یہ تاثر مِلتا ہے کہ ترجمہ شاید کوئی بہت ہی آسان کام ہے.... اور ہر کَس و ناکَس یہ کر سکتا ہے۔ ایسا ہر گز نہیں ہے۔ اس مُلک میں ہزاروں بلکہ

شاید لاکھوں، انگریزی جاننے والے موجود ہیں۔ کیا وہ سب کے سب ترجمے کی اہلّیت رکھتے ہیں؟ اور اگر رکھتے ہیں تو کیا اُن کا ترجمہ ایسا ہوتا ہے کہ عام قاری اُسے دلچسپی سے پڑھ سکے؟"

ہم نے اظہر کلیم صاحب کے اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ قارئین خود بھی بہتر طور پر جواب سے آگاہ ہیں۔ ہم نے گزشتہ سوالوں کے نوکیلے پَن کو کچھ کم کرنے کے لئے پُوچھا۔ "اُردو اور انگریزی فکشن میں کس سے متاثر ہیں اور کیوں؟"

"اُردو فکشن میں محترم ابنِ صفی اور کرشن چندر سے متاثر ہُوں۔ محترم ابنِ صفی کو ایک تو میں اس بِنا پر عدیم المثال مصنّف سمجھتا ہُوں کہ وہ ہر صنف کے اَدب پر حاوی تھے۔ کرشن چندر کی تحریر کی روَانی، سلاست اور خوبصورتی ناقابلِ تشریح ہے۔ صحیح معنوں میں اس شخص نے ناول نگاری کو ایک نیا اَسلوب دیا جس کی خوشہ چینی متعدد اَدیبوں نے کی۔ انگریزی فکشن میں اب تک مجھے، کارنل وُولرچ نے متاثر کیا ہے۔ جزویات نگاری اور زبان کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ جس قدر بے عیب انداز میں وُولرچ کہانی کا تانا بانا تیار کرتا تھا، وہ اُسی کا حصّہ تھا۔ بہر حال، انگریزی فکشن، ایک بحرِ ذخّار ہے۔ ابھی تو اس میں غوطہ خوری جاری ہے، ہو سکتا ہے، وُولرچ کا کوئی ہم پَلّہ یا اُس سے بہتر مل جائے۔"

"کبھی ایسا بھی ہُوا کہ کسی ناول یا کہانی کو پڑھ کر، آپ نے حسرت سے سوچا ہو کہ کاش! میں بھی ایسا لکھ سکتا؟" ہم نے پوچھا۔

"جی ہاں...." اظہر صاحب نے بِلا تامّل یہ اعتراف کر کے ہمیں حیرت میں ڈال دیا۔ "اِنہی تین مصنّفوں کی کئی تحریریں پڑھنے کے بعد یہ کیفیّت ہوئی۔"

"کہتے ہیں کہ کسی پیشے کو مستقل اختیار کئے رکھنے سے ذہن ایک خاص مزاج میں ڈَھل جاتا ہے۔ سُراغرسی کی کہانیاں لکھتے اور ترجمہ کرتے آپ کو عرصہ ہو گیا۔ کبھی سُراغرسانی کی یا کرنے کو جی چاہا....؟" ہم نے شرارتاً اظہر صاحب کو کریدا۔

"ضروری نہیں کہ مٹھائیاں تیار کرنے والا حلوائی، اُنہیں بھی کھانے کا شوقین ہو جائے۔" اظہر صاحب نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "بہر حال، چھوٹی موٹی سُراغرسانی کے جراثیم، ہر انسان میں موجود ہوتے ہیں اور وہ روزمرّہ زندگی میں وقتاً فوقتاً اُن کا استعمال بھی کرتا ہے مگر اُسے احساس نہیں ہوتا۔ میرا،

باقاعدہ سُراغرسانی کرنے کو کبھی جی نہیں چاہا اور نہ ہی کوشش کی۔ البتہ اتنا لٹریچر پڑھنے کے بعد جب میں اپنے مُلک میں پولیس اور سراغرساں اِداروں کے فرسُودہ طریقِ کار اور وسائل کی کمی کو دیکھتا ہُوں تو دِل جلتا ہے۔"

"جو پیشہ آپ اِس وقت اختیار کئے ہُوئے ہیں، آپ کی نظر میں کیسا ہے؟" ہم نے جاننا چاہا۔

"بہت اچھا اور باعزّت.... البتّہ اس میں بیشتر افراد عُموماً تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔ اِدارے کی حد تک کوئی پریشانی نہ بھی ہو مُلکی سطح پر مختلف مصنُوعات کے آئے دِن کے بحرانوں کی وجہ سے ایک بے نام خطرہ سالاحق رہتا ہے۔ میرا یہ نقطۂ نظر انفرادی کم.... اور ملکی زیادہ ہے۔" اظہر صاحب نے جواب دیا۔

"کیا اپنے بچّوں کو بھی اپنے جیسا بنانا پسند کریں گے؟" ہم نے مستقبل میں جھانکا۔

"یہ بچوں کی خواہش اور اُن کے رجحانات پر منحصر ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور کیا بننے کی صلاحیّت رکھتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں کوئی حکم اُن پر مسلّط نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہوتا ہے۔" اظہر صاحب نے مختصر مگر واضح الفاظ میں اپنا نقطہ ءِ نظر بیان کیا۔

ہمارے خیال میں اظہر صاحب کی ذات کے بارے میں خاصی واضح و تفصیلی گفتگو ہو چکی تھی۔ اس لئے ہم نے بہتر سمجھا کہ اب اَصل اور اہم مسئلے کی طرف آنا چاہیئے یعنی ڈائجسٹ کی طرف.... لیکن اس سے پہلے ہم نے اظہر صاحب سے ایک وضاحت چاہی۔ "اِس وقت آپ، میرے سامنے نہیں بلکہ اپنے قارئین کی عدالت میں موجود ہیں، جہاں آپ کو مختلف الزامات کا سامنا کرنا ہے۔ کیا آپ خود کو مُلزم محسوس کر کے جواب دینے کے لئے تیار ہیں؟"

"ملزم محسوس کر کے تو نہیں البتّہ مُلزم تصّور کر کے جواب دینے کے لئے تیار ہُوں۔" اظہر صاحب نے جانے کیوں یہ تصحیح ضروری سمجھی۔ "میں، آپ کی طرف سے اِنٹرویو کی فرمائش سُنتے ہی سمجھ گیا تھا کہ میرے سمن آئے ہیں ورنہ خواتین کے لئے مخصوص "آنچل" میں میرا کیا کام، بہر حال، میں ہر الزام کا جواب سچّائی سے دوں گا اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر اپنا دفاع کروں گا۔ آپ فرماتی رہیں۔"

"بنیادی طور پر آپ ڈائجسٹ کی تشریح کیسے کریں گے....؟" الزامات کے آغاز سے پہلے ہم نے کچھ معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری معلومات اپنی جگہ سہی، اس وقت تو ہمیں اُس سے غرض تھی جو اظہر صاحب فرماتے۔

"ڈائجسٹ ایک ایسے ماہنامے کو کہتے ہیں جو اُردو زبان میں شائع ہوتا ہے تو اُس کا ہاضمہ بہت اچھا ہو جاتا ہے جو یہ نہیں دیکھتا کہ کس زبان کا پکوان ہاتھ لگ رہا ہے۔ بس، ہر بہترین چیز نِگل جاتا ہے اور اسی عالم میں، یعنی اپنے شکم میں دُنیا کی بہترین تحریروں کا ذخیرہ لئے، قارئین کے سامنے پہنچ جاتا ہے۔" اظہر صاحب کی یہ تشریح اپنی جگہ جامع اور پُر معنی تھی۔ تاہم، ہم اس پر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"کیا ڈائجسٹ کا تصّور، امریکہ کے مشہور ڈائجسٹ "ریڈرز ڈائجسٹ" کا چربہ ہے؟" ہم نے پُوچھا۔

"اس میں شک نہیں کہ "ریڈرز ڈائجسٹ" دُنیا کا وہ مقبُول ترین ماہنامہ ہے جو سات بڑی زبانوں میں شائع ہوتا ہے اور دُنیا کا واحد رسالہ ہے جو نابیناؤں کے لئے اُبھرے ہُوئے حروف میں بھی تیار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ڈائجسٹ کو اس کا چربہ کہنا یُوں مناسب نہیں کہ ریڈرز ڈائجسٹ میں فکشن یعنی تخّیلاتی اَدب برائے نام اور شاذونادر ہی چھَپتا ہے جبکہ ہمارا دارومدار ہی فکشن پر ہے اور یہ ہماری ایک معاشرتی ضرورت ہے کیونکہ ہمارے معاشرے کے فرد کے لئے یُوں بھی چاروں طرف "خشکی ہی خشکی" ہے۔ پندونصائح کی بھرمار ہے۔ عام شہری کو کچھ نہ کچھ سکھانا، کوئی تعمیری پیغام، اُس تک پہنچانا، ہمارا بھی نصب العین ہوتا ہے لیکن ہم یہ کام باتوں باتوں میں، تفریح ہی تفریح میں کرتے ہیں۔ تاکہ پہلے سے بیزار قاری، مزید بیزار ہو کر ہم سے دُور ہی نہ بھاگ جائے۔ اس طرح کی معاشرتی ضرورتوں کو چربہ نہیں کہا جاسکتا۔ بالکل اسی طرح، جیسے پاکستان نے اگر کبھی ایٹم بم بنایا تو اُسے چربہ نہیں کہا جائے گا۔" اظہر صاحب نے اپنے قلم کو اُنگلیوں کے درمیان مسلسل گھُماتے ہُوئے کہا۔

"کیا واقعی ڈائجسٹ کی کوئی معاشرتی افادیت ہے؟" ہم نے اُن کی وضاحت کو کچھ تشنہ سمجھتے ہُوئے پُوچھا۔

"مُلک کو معقول زرِ مبادلہ، ہزاروں اَفراد کو روزگار اور لاکھوں افراد کو تفریح فراہم کرنے والی چیز کی افادیت میں آپ کو کوئی شک ہے؟" اظہر صاحب نے فوراً ہم سے پوچھا.... اور جب ہم نے نفی میں سر ہلایا تو مزید کہا۔ "ہم اس اِنٹرویو میں زیادہ گہرائی اور تفصیل میں جانے کے متحمل نہیں ہوسکتے ورنہ میں، آپ کو وضاحت سے بتاتا کہ اِس اُلجھن زدہ اور یاسیت پرور معاشرے میں ڈائجسٹ نے کتنی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ڈائجسٹ نے اُن لوگوں میں بھی پڑھنے کا ذوق پیدا کیا ہے جن کا اُردو سے دُور، دُور کا تعلّق بھی نہ تھا اور اس لحاظ سے اس کی یہ خدمت، میرے خیال میں "مقتدرہ قومی زبان" کی بہت سی خدمات پر بھاری ہے جسے سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ جبکہ ڈائجسٹ ایک خودرو پودا ہے۔ ڈائجسٹ نے کتابت و طباعت کے میدان میں جدّتوں کو رائج کیا ہے۔ مقابلے کی گہما گہمی پیدا کی ہے جو بے شمار افراد کی صلاحیّتوں کو نکھارنے میں مدد دیتی ہے۔ ڈائجسٹ کا کوئی قاری جب بیرونِ مُلک جاتا ہے تو وہ مُلک اور وہاں کی روایات، اُس کے لئے اجنبی اور پریشانی کا باعث نہیں ہوتیں۔ ڈائجسٹ نے ہلکی پُھلکی کہانیوں کے ساتھ ساتھ، دُنیا کی معروُف اَدبی تخلیقات اور کلاسِکس کو بھی جس تیزی سے اُردو میں مُنتقل کیا ہے اور اُنہیں جس طرح ایک عام اور کم پڑھے لکھے آدمی تک پہنچایا ہے، یہ کام شاید سرکاری سرپرستی میں چلنے والے کئی اِدارے اور بزعم خود اَدب کے ٹھیکیدار بھی مِل کر نہ کرپاتے۔"

"کیا ہمیں، اُردو میں ڈائجسٹ کا متبادل لفظ نہیں مِل سکتا؟" ایک ضمنی سوال ہماری زبان پر آگیا۔

"متبادل ڈھونڈنے کے چکّر میں ہم دِن بدِن اپنی زبان کو ثقیف تر بنارہے ہیں اور اس طرح دَر حقیقت، ہم اُردو سے محبّت کا نہیں مگر نادانستہ طور پر دُشمنی کا ثبوت دے رہے ہیں۔" اظہر صاحب کے لہجے میں دُکھ سمٹ آیا۔ "اُردو کی بُنیادی خاصیت اور اُس کے اب تک زندہ رہنے کی وجہ یہی تھی کہ یہ دِھیرے دِھیرے، دریا کی طرح دُنیا بھر کی زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر ضم کئے جارہی تھی، عام فہم الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹے جارہی تھی۔ اب ایک عجیب رجحان پیدا ہوگیا ہے کہ ہم، فارسی، عربی اور حتّیٰ کہ ہندی زبانوں تک سے ثقیل ثقیل اور عام آدمی کے لئے ناقابل فہم الفاظ لا لا کر شامل کرنے کی دَوڑ میں شریک ہیں مگر انگریزی کو غلامی کی علامت اور پتہ نہیں کیا کیا قرار دیتے ہیں۔ یہ محض ایک کومپلیکس ہے اور کچھ نہیں۔ میں انگریزی زبان کو اپنانے کے حق میں نہیں ہُوں مگر اُردو کو مشکل بنانے

کے حق میں بھی نہیں ہُوں۔ ڈائجسٹ کو میں اب انگریزی کا لفظ نہیں سمجھتا جیسے اسکول، کار، انجن، مشین، موٹر وغیرہ اب انگریزی کے الفاظ نہیں رہے۔ براہِ مہربانی ڈائجسٹ کو بھی اپنی زبان کا لفظ بنا لیجئے۔"

"کیا ہم، ڈائجسٹ کو ایسی غِذا تصّور کر سکتے ہیں جو جسم، رُوح اور ذہن، تینوں سطحوں پر انسان کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہو؟" ہم نے پُوچھا۔

"جی ہاں، ڈائجسٹ ایک، زود ہضم غِذا، ہے جو قارئین کو تینوں سطحوں پر زندہ رکھنے کے عوامل فراہم کرتی ہے۔" اظہر صاحب نے کہا۔ "یہ تاریخ، جغرافیہ، سائنس، انجینئرنگ، مذہبِ انسانی اور حیاتِ انسانی کے ہر پہلُو کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈائجسٹ اور ٹی۔ وی میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ ڈائجسٹ کم قیمت لیکن بے حد دلچسپ اور ٹی۔ وی بہت مہنگا لیکن غیر دلچسپ ہے۔ ٹی۔ وی کے اوّل تا آخر پروگرام دیکھ لیجئے۔ انہی موضوعات کو آپ ڈائجسٹ میں بھی پائیں گی بلکہ ہمارے یہاں موضوع لامتناہی ہیں اور پیشکش کا انداز زیادہ دلچسپ ہے۔ حالانکہ ڈائجسٹ بصری ذریعۂ ابلاغ نہیں اور اس کی بنیاد حکُومت نہیں، افراد اپنے ذاتی وسائل سے ڈالتے ہیں۔"

"اظہر صاحب! اب ہم الزامات کی طرف آتے ہیں۔" ہم نے کہا تو اظہر صاحب کچھ اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "ایک محترمہ جو کہ مقامی بینک میں مُلازم ہیں، ڈائجسٹوں پر الزام عائد کرتی ہیں کہ یہ جرائم پیشہ اَفراد کے لئے ایک تربیّت گاہ کا کام دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ سنسنی خیز انگریزی تراجم کے ذریعے، جرائم کے نئے طریقِ کار کی عکّاسی کرتے ہیں۔"

اظہر کلیم صاحب متاسّفانہ انداز میں مُسکرائے.... اور اسی لہجے میں کہنے لگے۔ "اصل میں ہمارے ہاں لوگ کتابوں سے اپنے اپنے رجحان اور نظریے کے مطابق ٹکڑے نکال لینے اور مطالب و مفہُوم میں تحریف کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ مکمّل سیاق وسباق کو سامنے نہیں رکھتے۔ لوگ تو حدیثوں میں بھی تحریف (نعوذ باللہ) کرنے سے نہیں چُوکتے۔ مثلاً وہ حدیث ہے۔ "مت جاؤ، نماز کے قریب...." اس حدیثِ پاک کو اگر صرف یہیں تک پڑھا جائے اور کہا جائے کہ اس حدیث میں نماز کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے تو یہ اخلاقی اور مذہبی بددیانتی کی ایک مکروہ مثال ہے۔ حالانکہ پوری

حدیث یُوں ہے۔ ''مت جاؤ نماز کے قریب جب تم نشے کی حالت میں ہو۔'' ڈائجسٹوں کے معاملے میں بھی لوگ مکمّل سیاق وسباق کو زیرِ بحث نہیں رکھتے۔ وہ کہتے ہیں.... کہ ڈائجسٹوں میں جرائم کی کہانیاں چَھپتی ہیں۔ حالانکہ ننانوے فیصد کہانیاں جرائم کی نہیں 'جرم وسزا' کی ہوتی ہیں۔

ایک مجرم بڑی ذہانت کے ساتھ اور دوسروں کے تجربات سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے، ایک بے عیب منصُوبہ بناتا ہے مگر عملِ مکافات کے تحت یا تو وہ خود ہی اپنے بنائے ہُوئے گڑھے میں گِر جاتا ہے یا اُس سے بھی کہیں زیادہ ذہین ایک پولیس اَفسر اُس کی کسی معمولی فروگزاشت کی بنا پر بالآخر اُسے گرفت میں لے لیتا ہے۔ گویا جُرم کے ساتھ اُس کا انجام بھی واضح کیا جاتا ہے تو پھر کیوں ڈائجسٹوں پر جرائم کی ترویج کا الزام لگایا جاتا ہے؟ یہ الزام عائد کرنے سے پہلے اخبارات کو جرائم کی خبروں سے پاک کر دیا جاتا تو شاید میں بھی قائل ہو جاتا۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ اخبارات میں ڈاکے، فراڈ، قتل اور اغوا کی خبریں اتنے مکروہ انداز میں کیوں شائع ہوتی ہیں؟ شاید اس لئے کہ جب انجام کار مُجرم قانون کی گرفت میں آ جائیں تو لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ کیا کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اگر یہی جواز ہے تو ڈائجسٹ کی کسی بھی کہانی پر اُنگلی رکھ کر بتایئے کہ اُس کا انجام، پڑھنے والوں کو کہاں جُرم کی ترغیب دیتا ہے؟ اس کے علاوہ میں، بینک میں کام کرنے والی اُن محترمہ سے صرف ایک سوال کروں گا کہ کیا اُنہوں نے کبھی سروے کیا ہے کہ مختلف جرائم کے سلسلے میں جیلوں میں جتنے قیدی موجود ہیں، اُن میں سے کتنے، جُرم کرنے سے پہلے ڈائجسٹ پڑھتے تھے؟ اگر وہ صرف کسی ایک جیل کے اعداد و شمار لیں تو اُنہیں پتہ چلے گا کہ نوّے فیصد مُجرم تو سرے سے ہی اَن پڑھ ہیں اور باقی دَس فیصد میں سے اُنہیں شاید ایک فیصد بھی ڈائجسٹ پڑھنے والے نہ ملیں....

ڈائجسٹ وہی لوگ پڑھتے ہیں جو معاشرے میں تندہی سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور فارغ وقت کے لئے اُنہیں ایک آسان ذہنی تفریح دَرکار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دیہاتوں میں یہ جو چِٹے اَن پڑھ کاشتکار، پانی یا چند گز زمین کے جھگڑے پر بیسیوں.... انسانوں کو قتل کر دیتے ہیں، خاندان کے خاندان کو گھر میں بند کر کے زندہ جلا دیتے ہیں تو کیا وہ، ڈائجسٹ پڑھ کر ہی ایسا کرتے ہیں؟ کیا جرائم ڈائجسٹوں کی اشاعت کے بعد ہی شروع ہُوئے ہیں؟ کیا 1969ء سے پہلے جرائم نہیں ہوتے تھے؟ آدمؑ

کے بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا تو اس نے کونسا ڈائجسٹ پڑھا تھا؟ جُرم، دَر حقیقت جاہل اور بیمار ذہن کی پیداوار ہوتا ہے اور جاہل و بیمار ذہن مطالعے کا ذوق نہیں رکھتے۔

دراصل اس قسم کے عوامل پر جرائم کی ترویج کی ذمّے داری ڈالنا ہمارے انتظامی اِداروں کی اس نااہلی کی دلیل ہوتا ہے کہ وہ جرائم کے اصل اسباب کی بیخ کُنی کرنے میں ناکام رہے ہیں اور یہ ہر ذی شعور شہری جانتا ہے کہ جرائم کے اصل اسباب کیا ہیں اور یہ کِن کِن ہستیوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھتے ہیں اور کِن کی پُشت پناہی کے بل پر مُجرم معاشرے میں دَندناتے پھرتے ہیں۔

مجھے افسوس اسی بات کا ہے کہ آج تک کسی پولیس اَفسر یا کسی اور تفتیشی اِدارے کے کسی اَفسر نے یہ نہیں کہا کہ میں نے ڈائجسٹوں کی کہانیوں میں فلاں پولیس اَفسر کے کردار کی ذہانت سے متاثر ہو کر یہ سیکھا اور فلاں جگہ اس عِلم کو استعمال کیا۔ اس قسم کے ذمّے دار افراد سے میری درخواست ہے کہ اگر ہو سکے تو کبھی اِن کہانیوں سے کچھ سیکھنے کی کوشش کریں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ فلاں شخص مُجرم ہے تو آپ ثبوت کے بغیر اُسے گرفتار نہیں کر سکتے، جہاں کا مُجرم پڑھا لکھا.... اور انتہائی شاطر ہے اور اُسے ایک معزّز شہری کے تمام حقوق حاصل ہیں اور اُس مُجرم کو بھی وہاں کا پولیس اَفسر، اُس کے حقوق پامال کئے بغیر، کوئی دھمکی، چھتّر، ڈنڈا یا تشدّد کے دیگر ذرائع استعمال کئے بغیر بالآخر قانون کی گرفت میں لے آتا ہے۔ بے شک یہ فکشن سہی، اِس میں مبالغہ سہی مگر خُدارا اِس سے کوئی تعمیری سبق لیجئے۔

اس کے علاوہ مَیں، بینک میں کام کرنے والی، اُن محترمہ کی خدمت میں ایک چھوٹا سا عملی ثبوت اپنے نظریات کے حق میں پیش کرنا چاہُوں گا کہ وہ، اِس ماہ کا ابنِ صفی میگزین یعنی ”نئے اُفق“ پڑھ کر دیکھیں اور مجھے لکھیں کہ اسے پڑھنے کے بعد کون سا جُرم کرنے کو اُنکا دِل چاہا؟ اگر وہ کہانیوں کے انجام پر، جُرم کرنے کے خیال ہی سے توبہ نہ کر لیں تو مجھے لکھیں، میں فوراً اس پیشے سے کنارہ کشی کر لوں گا.... معاف کیجئے، میرا یہ جواب کچھ طویل ہو گیا مگر اس موضوع پر میرے پاس ابھی کہنے کے لئے اور بھی بہت کچھ ہے۔ بے شمار دلیلیں ہیں مگر میں سرِ دست اسی پر اکتفا کرتا ہُوں۔“

''ہم تو آپ کے اس جواب سے مطمئن ہوگئے۔'' ہم نے تسلیم کیا۔ ''قارئین کا فیصلہ ہم، اُنہی پر چھوڑتے ہیں۔ یہ بتائیے کہ ڈائجسٹ ترجموں پر اتنا انحصار کیوں کرتے ہیں؟ کیا یہ کسی احساسِ کمتری کی دلیل نہیں؟''

''جی نہیں، یہ احساسِ کمتری نہیں، مجبُوری کی دلیل ہے.... بی بی! اگر گھر میں اچھا کھانا پکتا ہو تو ہوٹل میں کھانے کون جائے گا....؟ ہمارے یہاں جتنے ڈائجسٹ چھپتے ہیں، اُن سب کو مجموعی طور پر ہر ماہ ڈیڑھ سو معیاری کہانیاں دَرکار ہوتی ہیں۔ جب کہ ہمارے یہاں بڑے بڑے مصنّفوں وادیبوں کا یہ عالم ہے کہ کسی نے دَس سال سے اور کسی نے پندرہ سال سے کوئی نئی کہانی ہی نہیں لکھی۔ نئے لکھنے والوں کو ایک لڑکا، ایک لڑکی اور وِلن کی مثلّث کے علاوہ کوئی موضوع نہیں ملتا۔ اس میں شاید اُن کا بھی کوئی قصُور نہیں۔ معاشرے کی محدودیت نے اُنہیں کنویں کا مینڈک بنا دیا ہے۔ اوسط دَرجے کا، لکھنے والوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں اور وہ ہر ماہ باقاعدگی سے طبع زاد کہانیاں زیادہ نہیں لکھ سکتے.... تو پھر آپ ہی بتائیے کہ کیا ہو گا؟ آپ ہمیں ایسے لکھنے والے مہیّا کر دیجیے جو ہر ماہ، ہر ڈائجسٹ کے مطلب کی ڈیڑھ سو طبع زاد کہانیاں لکھ دیا کریں، ہم ترجمے چھاپنا چھوڑ دیں گے۔''

اظہر صاحب نے صاف طور پر ہمیں چیلنج کر دیا تھا لیکن سر دست ہم اس چیلنج کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اس لئے ہم نے اَگلے سوال کا سہارا لیا۔ ''ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی تحریریں کب تک زندہ رہیں گی؟ ہماری مُراد ترجموں سے ہے۔''

''ترجمے، ہم اس لئے نہیں چھاپتے کہ وہ زندہ رہیں، اِس لئے چھاپتے ہیں کہ ترجمہ کرنے والے زندہ رہیں۔ اُن کہانیوں کے فانی یا لافانی ہونے کی فِکر، اُن کے اصل مصنّفین کو کرنی چاہیئے۔'' اظہر صاحب نے کچھ زیادہ ہی کَھرا جواب دیا۔

''نئے لکھنے والوں کے سامنے آنے کے عمل کو کہیں ڈائجسٹوں ہی نے تو نہیں رَوک دیا؟'' ہم نے ذہن میں مچلتے ہُوئے شُبہے کا اظہار کیا۔

''جی نہیں.... ڈائجسٹوں نے تو بیسیوں نئے لکھنے والے متعارف کرائے ہیں۔ البتّہ ڈائجسٹوں نے ان لوگوں کو آگے آنے سے ضرور رَوک دیا ہے جو فن کے بَل پر نہیں، پبلک ریلیشنگ کے بَل پر آگے

آنے کے ماہر تھے کیونکہ ڈائجسٹ کا قاری کہانی دیکھتا ہے، اُسے جھانسا نہیں دیا جاسکتا۔ اُسے اُلّوؤں اور چمگادڑوں کی علامتی تجریدی کہانیاں دے کر نہیں بہلایا جاسکتا۔"

"کراچی سے شائع ہونے والے تمام ڈائجسٹوں کا انداز خفیف سے فرق کے ساتھ ایک جیسا ہے۔ ایسا کیوں ہے....؟" ہم نے اعتراض اُٹھایا۔

"میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ آپ کا یہ سوال عجیب سا ہے۔ بھئی، یہ تو سیدھی سیدھی رسَد اور طلب کی بات ہوتی ہے۔ اب آپ کسی کلاتھ مارکیٹ میں جائیں اور اعتراض کریں کہ یہاں تو سب دُکانوں کی سجاوٹ خفیف سے فرق کے ساتھ ایک جیسی ہے اور سب کے پاس وہی کپڑے رکھے ہیں تو آپ کے اعتراض کو عجیب ہی سمجھا جائے گا۔ بہرحال، آپ کے اطمینان کے لئے عرض ہے کہ اگر آپ بہ نظرِ غائر پڑھیں اور تجزیہ کریں تو ہر ڈائجسٹ کی اپنی ایک پالیسی ہوتی ہے۔ اُن کے درمیان خفیف نہیں، خاصا فرق ہوتا ہے۔" اظہر صاحب نے وضاحت کی۔

"تو گویا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کمرشل لِٹریچر ہے؟ دُکانداری کی طرح ایک تجارت ہے؟" ہم نے بات اُچکنے کی کوشش کی۔

"جی ہاں، یہ کمرشل لَٹریچر ہے لیکن اس میں شرم کی ایسی کیا بات ہے جو آپ لِٹریچر کے ساتھ کمرشل کا لفظ لگاتے ہُوئے یوں جھجک رہی ہیں گویا خُدانخواستہ یہ کوئی گالی ہو۔" اظہر کلیم مربّیانہ انداز میں مُسکرائے۔ "بڑے بڑے اور آفاقی شہرت کے حامل اَدیبوں کی کتابوں اور کلاسیک کتابوں تک کی فروخت سے اُن کے مصنّفوں کو رائلٹی دی جاتی ہے اور پبلشر بھی اپنا حصّہ کماتے ہیں۔ وہ کتابیں اِس کمرشل عمل کے باوجود بہرحال، اَدبی شہ پارے ہی کہلاتی ہیں۔ ڈائجسٹ بھی یہی کرتے ہیں تو یہ کمرشل ازم کوئی تخریبی کارروائی تو نہیں، تعمیری کام ہی ہے۔ ہر شخص اپنے فن، اپنے ہُنر سے روزی کماتا ہے تو اگر لکھنے اور چھاپنے والے اپنے اپنے فَن، ہُنر اور محنت سے اپنا حقِ محنت کماتے ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟"

"سرِوَرق پر آپ خواتین کی تصویریں ہی کیوں چھاپتے ہیں کوئی خُوشنما منظر کیوں نہیں؟" ہم نے پُوچھا۔

''کیاخواتین کے چہرے پر خوشنما مناظر میں شمار نہیں ہوتے....؟'' اظہر صاحب نے نہایت معصومیّت کے ساتھ اُلٹا ہم سے سوال کرڈالا۔ لیکن ہم نے بھی تہیّہ کرر کھا تھا کہ ہم، اُن کے کسی سوال کا جواب نہیں دیں گے کیونکہ ہم صرف جواب لینے آئے تھے۔ اگر ہم اپنی ہانکنے بیٹھ جاتے تو اظہر صاحب کا اِنٹرویو رہ جاتا۔

''جب اتنے ڈائجسٹ پہلے ہی شائع ہورہے تھے تو 'نیارُخ' کا اجرا کیوں کیا گیا؟''

''آپ کے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے تھا؟'' ایک بار پھر اُنہوں نے سوال کے جواب میں سوال کرڈالا۔

''ہم کیا بتاسکتے ہیں....'' ہم نے بے بسی سے کہا۔

''بس، اسی طرح کوئی بھی، کام کی بات نہیں بتاسکا۔ اِس لئے ہم نے سوچا کہ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔'' اظہر صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔

''یہ کس لحاظ سے مُنفرد ہے؟'' ہم بھی سولات کے نت نئے نشتر چبھونے پر تُلے ہُوئے تھے۔

''یہ اس لحاظ سے مُنفرد ہے کہ اس کے بانی، محترم ابنِ صفی ہیں۔'' اُنہوں نے گہری عقیدت آمیز سنجیدگی سے جواب دیا۔

''والدین کو اعتراض ہے کہ ڈائجسٹ پڑھنے کے بعد نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آئیڈیل بنالیتے ہیں....اور زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے اور اُن کا سامنا کرنے کی جرأت اُن میں بتدریج کم یا ختم ہو جاتی ہے۔'' ہم نے والدین کی شکایت، اُن تک پہنچائی۔

''مجھے حیرت ہُوئی ہے کہ اتنی غیر حقیقی بات، والدین، جیسی تجربہ کار ہستیاں کہہ سکتی ہیں۔ اس ضمن میں، مَیں یہی عرض کروں گا کہ آئیڈیل بنالینا انسانی فطرت ہے۔ اس کے علاوہ یہ انسان کی ذہنی صحت مندی کی دَلیل ہے۔ بے وقوفوں اور ناکارہ اِنسانوں کا کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا۔ آئیڈیل سے تو انسان میں جدِّوجُہد اور زندگی سے محبّت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ڈائجسٹ آئیڈیل بنانے میں مدد دیتے ہیں تو میرے خیال میں یہ بہترین اتالیق بھی ہیں۔ اب اگر کوئی، شیخ چلّی کی کہانی پڑھ کر، شیخ

چلّی کو آئیڈیل بنالیتا ہے تو اس میں قصُور، اس کہانی یا شیخ چلّی کا نہیں، اُس شخص کی کم عقلی کا ہے۔ اُس پر ماتم کیجئے۔" اظہر صاحب نے مشورہ دیا۔

"ہمارے ڈائجسٹوں کو قومی تعمیر میں بھی کوئی حصّہ ہے یا یہ محض وقت گزاری کا ذریعہ ہیں؟" ہم نے جاننا چاہا۔

"پُر امن اور شریفانہ انداز میں وقت گزارنا بھی قومی تعمیر کا ایک حصّہ ہے۔ مُطالعہ بہر حال، آپ کو کچھ دیتا ہی ہے، آپ سے چھینتا کچھ نہیں۔"

"مشرق اور مغرب کے ڈائجسٹوں میں، آپ کیا نمایاں فرق محسوس کرتے ہیں؟"

"آئے دِن کے بُحرانوں، طباعت سے متعلقہ تمام چیزوں کی روز بروز بڑھتی ہُوئی قیمتوں اور مُلک میں تعلیم کا تناسب کم ہونے کے باوجود، ہمارا مشرقی ڈائجسٹ، مغربی ڈائجسٹ سے بہت آگے ہے۔ انگریزی کے شاید بیس رسالے مِل کر بھی ہمارے ایک ڈائجسٹ جتنا مواد، اس قیمت میں فراہم نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ مُلکی وسائل محدود ہونے کے باوجود، ہم نے ڈائجسٹ کی طباعت میں ترقی یافتہ مُمالک کے ڈائجسٹوں سے بہتر معیار قائم کیا ہے۔"

"آپ کے خیال میں ڈائجسٹوں نے ہمارے مُلک کے سیاسی حالات میں کیا کردار اَدا کیا ہے؟" ہم نے ایک نازک سوال چھیڑا۔

"یہ سوال، آپ اُن ڈائجسٹوں کے مدیران سے کیجئے جن کے یہاں سیاست شاملِ اشاعت ہوتی ہے اور جو خود بھی سیاسی جوڑ توڑ میں گہری عملی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہم تو بے ضرر سے گوشہ نشین ہیں۔" اظہر صاحب نے نہایت غیر جانبداری سے کہا۔

"کیا ڈائجسٹوں کی بہتات، نوجوان نسل کے لئے افیون کا کام نہیں دے رہی جن کے ذریعے وہ بے کاری و بیروزگاری کا وقت سہانے خوابوں کی دُنیا میں گزارتے ہیں؟ ہم نے پُوچھا۔

اظہر صاحب بے ساختہ ہنس دیئے۔ اُن کے جواب سے ہمیں، اُن کی ہنسی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔

"بی بی! بیکار و بیروزگار لوگ رسالے خریدنے کے متحمّل کہاں ہو سکتے ہیں؟ رسالے خریدتے وقت تو

اچھے بھلے، باکار اور برسرِ روز گار، آدمیوں کا ہاتھ کانپ جاتا ہے۔ آپ کو شاید اعزازی کاپیاں مِل جاتی ہوں، اِس لئے آپ کو ان کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ ہو۔"

"اَدبا اور بیشتر اَدبی جرائد، ڈائجسٹوں سے ناراض ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ڈائجسٹوں نے قارئین کا اَدبی ذوق چھین کر سنسنی خیز اور ہیجان کی راہوں پر گامزن کر دیا ہے اور ادبی جرائد کی اشاعت کو متاثر کیا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟" ہم نے ایک انتہائی اہم اور متنازعہ سوال کیا۔

"اس ضمن میں دونوں اطراف سے بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے۔" اظہر صاحب نے گویا الفاظ کو ناپتے اور تولتے ہُوئے کہا۔ "میں اس ضمن میں صرف چند موٹی موٹی باتوں کی نشاندہی کروں گا۔ پہلی بات تو یہ کہ اَدبی پرچوں کو یہ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار کسی نے نہیں دیا کہ کون سا پرچہ اَدبی ہے اور کون سا غیر ادبی۔ میرے خیال میں سب پرچے اَدبی ہیں۔ البتّہ موضوعاتی اعتبار سے ان کے درمیان فرق ہے۔ دوسری بات یہ کہ ڈائجسٹوں نے اپنے آپ کو جدید دَور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے مگر اَدب کے ٹھیکے داروں نے اِس عمل کو سنسنی خیزی اور ہیجانی راہوں جیسے گُمراہ کُن نام دے دیئے۔ ڈائجسٹوں نے اَدبی پرچوں.... کی اشاعت کو بھی متاثّر نہیں کیا۔ متاثّر تو تب کرتے جب اُن کی کوئی اشاعت ہوتی۔ ڈائجسٹ کے آغاز سے پہلے بھی اَدبی پرچے کی اشاعت ہزار یا پانچ سو ہوتی تھی۔ آج بھی وہی ہے۔ اِس لئے یہ واویلا اصلیت کو چُھپانے کی کوشش ہے۔ اَدبی پرچوں کی پیشکش کا انداز.... (Presentation) تقسیمِ ہند کے وقت بھی کم و بیش یہی تھا جو آج ہے۔ اس لئے ان کی اشاعت بھی وہی ہے۔ آپ زمانے کے رنگ میں پُوری طرح نہ رنگیں مگر کچھ تبدیلیاں تو کرنا پڑتی ہیں جو نظر اور ذہن کو بھلی لگیں۔ آج کا قاری، سرورق کے نام پر چند آڑی ترچھی لکیروں اور کہانی کے نام پر اُلّوؤں اور چمگادڑوں کی علامات سے نہیں بہل سکتا۔ یہ میں پہلے بھی عرض کر چُکا ہُوں۔ قبُولیّت اور وُسعت حاصل کرنے کے لئے خطرات مول لینا پڑتے ہیں، سرمایہ کاری کرنا پڑتی ہے، بدلتے ہُوئے رجحانات پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔ تو، بی بی! یہ سب ناکامی کا واویلا ہے اور کچھ نہیں پھر چونکہ اُنہیں بزرگی کا لبادہ میسّر ہے، اس لئے وہ جو جی چاہے کہتے رہیں، ہم حقیقت بھی عرض کریں تو ہمیں گُستاخ سمجھا جاتا ہے۔"

”کہیں اسی سطح پر اپنے آپ کو منوانے کے لئے، آپ کے ادارے نے ایک خالصتاً اَدبی پرچے ”اقدام“ کا اجرا تو نہیں کیا؟“ ہم نے فوراً پوچھا۔

”جی ہاں۔ منوانا تو ہم چاہتے تھے لیکن روپیٹ کر اور واویلا مچا کر نہیں بلکہ کام کر کے اور عملی مثال پیش کر کے۔“ اظہر صاحب نے جواب دیا۔ ”ایک عرصے سے اَدبی پرچے ”اقدام خود کشی“ میں مصروف تھے۔ اس لئے ہم نے اَدبی ”اقدام“ شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ ایک دھماکہ ثابت ہُوا۔ میں خالصتاً اَدبی پرچوں کو مقبولِ عام بنانے کے سلسلے میں جن نظریات کا اظہار کر چُکا ہُوں، ”اقدام“ اُن کی عملی تفسیر ہے۔ ہم نے خزاں رسیدہ اَدب کو فرسُودگی پرست جاگیر داروں کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی۔ ”اقدام“ کا سائز اَدبی پرچوں کے مروّجہ سائز سے مختلف ہے، اسے جدید ترین طباعت کے تحت چھاپا گیا ہے۔ اس میں، مُلک کے گوشے گوشے میں بِکھرے ہُوئے اَدب پرستوں کے لئے دامنِ دِل وَا کیا گیا ہے۔ محض چند لوگوں سے تعلّق داریاں نِبھانے یا چار، چھ سو رُوپے کے اشتہارات لینے کی خاطر اُسے نہیں چھاپا گیا ہے۔ ہماری ان عملی کوششوں سے بفضلِ خُدا ”اقدام“ نے پاکستان میں شائع ہونے والے اَدب کے دعویدار تمام ماہناموں سے زیادہ اشاعت سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ میدان بھی انہی لوگوں کے ہاتھ رہے گا جو محض واویلا نہیں مچاتے، کام کرتے ہیں، وقت کی رفتار پر نظر رکھتے ہیں اور کامیابی و ناکامی کی اصل وجُوہ کو سمجھنے کا شعُور رکھتے ہیں اور خطرات مول لینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔“

”اظہر صاحب! یہ تو تھیں، الزامات، اعتراضات اور غلط فہمیوں کی باتیں۔ ہمارے خیال میں تقریباً تمام الزامات کے مدلّل جواب آپ دے چکے ہیں اور ہم نے اُنہیں جُوں کا تُوں، قارئین کی عدالت میں پہنچا دیا۔ اب ذرا دو ۲، ایک مختلف نوعیّت کے سوالات کے جواب عنایت فرما دیجئے۔“ اظہر صاحب ہمہ تن گوش تو تھے ہی۔ اِس لئے ہم نے بِلا تکلّف کہا۔ ”بین الاقوامی سطح پر ہم اپنے مُلک کے ڈائجسٹوں کو کس طرح متعارف کرا سکتے ہیں؟“

”آپ کی مُراد اگر یہ ہے کہ اُنہیں، اُن مُلکوں میں کیسے پہنچایا جائے جہاں اُردو پڑھنے والے موجود ہیں تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ بیشتر ڈائجسٹ ایسے تمام مُمالک میں جاتے ہیں۔ اس بر آمد کا دائرہ مزید اس طرح وسیع کیا جا سکتا ہے کہ کتابوں اور رسالوں وغیرہ کی نقل و حمل پر پابندیاں کم سے کم

ہوں۔ اگر اس سوال سے آپ کا مقصد یہ ہے کہ دوسری زبانیں بولنے والوں میں اُردو رسائل کو کیسے متعارف کرایا جائے؟ تو اس کے لئے بڑا وقت اور انتھک محنت چاہیئے۔ اردو کی ترویج و ترقی کے لئے متعصبّانہ بنیادوں پر نہیں، بلکہ سائنٹفیک بنیادوں پر بے پناہ کام کی ضرورت ہے اور اگر ہم اسی طرح ادبی اور غیر ادبی کی فروعی بحثوں میں پڑے رہے، ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کرتے رہے تو وہ دِن اور بھی دُور چلا جائے گا جب دُنیا میں اُردو پھیلے گی۔"

"نہایت سیر حاصل بحث رہی، اظہر صاحب!" ہم نے کاغذات سمیٹتے ہُوئے کہا۔ "اب ایک آخری سوال۔ قارئین کے لئے خصوصاً خواتین کے لئے اس کے سوا کوئی پیغام کہ وہ شب و روز ڈائجسٹوں کا مُطالعہ کیا کریں؟"

"آپ کو یہ گُمان کیسے گُزرا کہ میں، قارئین کو یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ وہ، شب و روز ڈائجسٹوں کا مُطالعہ کریں؟" اظہر صاحب کا لہجہ ایک بار پھر مربّیانہ ہو گیا۔ "اس سلسلے میں میری پُر زور گزارش ہے کہ ڈائجسٹوں کا مطالعہ انتہائی فالتو وقت میں کیا کریں جب آپ کے پاس وقت کا کوئی اور مصرف نہ ہو.... باقی رہا، پیغام، تو بیشتر قارئین سے تو "نئے اُفق" کے اداریے میں میرا تحریری تبادلۂ خیال ہو جاتا ہے۔ تاہم تمام قارئین سے عموماً اور خواتین سے خصوصاً میری درخواست ہے کہ جہاں آپ نے زندگی کے بہت سے رہنما اصُول بنا رکھے ہوں گے وہاں ایک اصُول میری طرف سے بھی شامل کر لیجئے جو دَر حقیقت ایک حدیث کا مفہُوم ہے اور وہ یہ کہ "بِلا تحقیق کبھی کسی کے متعلّق کوئی بات نہ کیجئے اور بِلا تحقیق کسی پر کسی الزام کو درست تسلیم نہ کیجئے اور نہ ہی اُسے آگے بڑھایئے۔"

اظہر صاحب کے اس اصُول کو سب سے پہلے ہم نے خود اپنے پلّے باندھتے ہُوئے اُن سے اجازت چاہی۔

(بشکریہ ماہنامہ آنچل)

محترم اظہر کلیم صاحب سے متعلق

اُن کا اصل نام محبوب عالم تھا۔ اُن کی پیدائش لائل پور (جس کا اب نام فیصل آباد ہے) میں ہوئی تھی۔ اُن کے والدین جالندھر سے ہجرت کر کے فیصل آباد آئے تھے انھوں نے ابتدا میں عمران کے کردار پر اپنے قلمی نام "اظہر کلیم" سے لکھا، یہ یاد نہیں کہ یہ نام انہوں نے مظہر کلیم کی پیروی میں اختیار کیا یا مظہر کلیم نے ان کی.... یا کوئی اور وجہ تھی۔

ایک نام ایم اے فرحت کے نام سے بھی کچھ ناول شائع کیے، فرحت ان کے پبلشر بھی تھے دوست بھی، میں نے اُس زمانے میں اپنی پامسٹری کی کتاب "پراسرا لکیریں" شائع کی تھی اور کچھ کشیدہ کاری کی کتب اور کچھ کتب پامسٹری سے متعلق شائع کرنے کا اعلان کر رکھا تھا۔

اظہر صاحب ایک روز گھر آئے اور مجھ سے کہا اگر آپ کو کسی مترجم کی ضرورت ہو یا ترجمہ کا کچھ کام ہو تو وہ میں کر سکتا ہوں، اپنے ساتھ وہ اپنی کچھ ناولیں بھی لائے تھے جنہیں دیکھ کر میں نے معذرت کر لی کیونکہ وہ محترم ابن صفی کے کرداروں پر لکھیں گئیں تھیں اس پر انھوں نے کہا یہ سب تو مجبوری میں کیا ہے اگر آپ ترجمہ کا کام دیں گے تو میں پھر ان کرداروں پر نہیں لکھوں گا۔ پھر واقعی انہوں نے ایسا ہی کیا۔

میں نے انھیں مشہور عالم پامسٹ 'کیرو' کی کتاب ترجمہ کرنے کے لیے دے دی میرا خیال تھا یہ صاحب دو ماہ کے لئے گئے، لیکن وہ تو دو ہفتے میں ہی کام مکمل کر لائے۔ میں نے دو تین دن بعد بلایا تاکہ ان کا کیا ترجمہ دیکھ لوں میں نے اُسی دِن، رات تک ان کا کیا ترجمہ پڑھ لیا۔ بڑا رواں اور آسان ترجمہ کیا۔ مجھے بہت پسند آیا۔

دُوسرے دِن صبح میں ابنِ صفی صاحب کی طرف جانے کو نکلا تو قریبی بس اسٹاپ پر انہیں کھڑے دیکھا تو گاڑی رَوک کر انہیں بلایا، پوچھا تو معلوم ہوا وہ وہیں میرے گھر سے قریب ہی رہتے ہیں۔ یہ واقعہ غالباً 1974ء یا 1975ء کا ہے۔ اس کے بعد میں نے اُن سے آٹھ دَس کتابوں کا ترجمہ کرایا، تمام کتب اُن کے ہی نام سے شائع کیں۔

اس عرصہ میں ان سے بہت اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ میرا تعلق تقریباً تمام ڈائجسٹوں سے تھا، میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ کچھ جاسوسی کہانیوں کا ترجمہ کر کے ڈائجسٹوں میں لکھنا شروع کریں، اُنھوں نے فوراً عمل کیا، دو کہانیاں ترجمہ کیں جو جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہو گئیں وہ بہت تیز لکھنے والے تھے۔

1976ء میں جب ابنِ صفی صاحب نے ایک شام ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”مشتاق میاں! میں نے تم سے بڑا احمق نہیں دیکھا تم نے اپنا اِدارہ احباب ادب ”سب رنگ“ نکلوانے کے چکر میں بند کر دیا پھر معراج رسول سے دوستی نبھانے میں جاسوسی سسپنس نکانے میں لگ گئے، اِس تو بہتر ہے کہ تم اپنا ہی کوئی پرچہ نکال لو“

میں خاموشی سے اُٹھ کر چلا آیا۔

دوسرے دِن اَظہر کلیم آئے تو پوچھنے لگے کہ رونی صورت کیوں بنائے ہوئے ہو، میں نے انہیں بتایا میری معراج رسول سے کچھ اَن بن ہو گئی ہے، ابن صفی صاحب کو بتایا تو انھوں نے بھی ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ تم خود کیوں نہیں اپنا کوئی ڈائجسٹ نکال لیتے، جب دوسروں کے لئے کام کر سکتے ہو تو اپنے لئے کیوں نہیں کر سکتے ؟

اتنا سننا تھا کہ اظہر کلیم کھڑے ہو گے اور اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے، بولے ”بھائی! اِس سے اچھا موقع کبھی نہیں ملے گا۔ سوچو... سوچو۔“

اُسی دِن، شام کو میں حسب معمول ابنِ صفی صاحب کی طرف گیا تو مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ”کیا ہُوا۔“

میں نے بیٹھے ہوئے کہا۔ ”آپ کے مشورے پر رات بھی سوچا اور صبح میں نے اظہر سے بھی مشورہ کیا، وہ بھی یہی کہہ رہا ہے۔ مگر میری ایک شرط ہے آپ سرپرستی کریں گے اور بطور مدیر آپ کا نام آئے گا۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ”ڈائجسٹ کا نام کیا رکھو گے ؟“

بِلا سوچے سمجھے میرے منہ سے نکلا۔ ”ابن صفی میگزین۔“

بولے۔ ”تمہارا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے یہ بھی کوئی نام ہوا۔“

میں نے کہا۔ ''جناب انگریزی میں 'مائک شین میگزین'، 'الفرڈ ہچکاک میگزین' آسکتے ہیں تو ابنِ صفی میگزین کیوں نہیں آسکتا؟''

وہ بولے۔ ''ڈیکلیریشن تو ہے نہیں اور آج کل پابندی بھی ہے اُس کا کیا کرو گے؟''

میں نے کہا۔ ''اللہ مالک ہے جس نے یہ خیال دِل میں ڈالا ہے وہی بندوبست کریگا۔''

جب یہ خبر اظہر کلیم نے سُنی تو خوشی کے مارے مجھے اُٹھا کر ناچنے لگا اُس ہی لمحہ سے وہ اُسکی تیاری میں لگ گیا۔ میں ڈیکلریشن کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ اللہ نے یہ مشکل بھی جلدی ہی آسان کر دی۔

اظہر کلیم بے شک ایک انتہائی مخلص اور محنتی دیانتدار ساتھی تھا اس کی عمر نے وفا نہ کی، بَھری جوانی میں بائیس برس پہلے اچانک ہی چھوڑ گیا۔ وہ لاہور اپنی بہن کے یہاں کسی تقریب میں چند رَوز کے لے گیا تھا بازار جاتے ہوئے دِل کا دَورہ پڑا سب کو رَوتا چھوڑ گیا۔

اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین۔

مشتاق احمد قریشی

مشتاق احمد قریشی صاحب نے نئے سال 2018ء کے لیے ایک تحفے کے طور پر مجھے یہ پیغام 31 دسمبر 2017ء کی رات 11 بج کر 56 منٹ پر بھیجا۔

(سید فہد حسینی)